Date of Publication: 09-05-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 May 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 May 2013
Issue: 19, Vol.:72

۱۵ تا ۲۱ رمئی ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر:۱۹، جلد نمبر:۷۲

یہ خطبہ ممتاز ادیب اور دانش ور ایڈورڈ سعید (مرحوم) نے اپنے دورۂ ہندستان کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیا تھا، جس کی افادیت کے پیشِ نظر اسے یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

مجھے اب تقریباً چالیس برس پڑھاتے ہوئے ہو چکے ہیں، زندگی کا بڑا حصہ میں نے یونیورسٹی کی شاندار فصیلوں کے اندر، پہلے بحیثیت طالب علم اور پھر بطور استاد کے گزارا ہے۔ میرے لیے اور یقیناً آپ سب کے لیے بھی، خواہ آپ کسی حیثیت سے دیکھیں، یونیورسٹی کا علاقہ بالکل انوکھا ہوتا ہے۔ ایک ایسا خواب ناک علاقہ جس کا جوہر خیال کی آزادی، تحقیق و جستجو کی آزادی، و اظہار کی آزادی ہے۔ یہ تو خیر ہم سب جانتے ہیں کہ یونیورسٹی وہ جگہ ہے جہاں ہم سیکھتے بھی ہیں اور اختیار بھی پاتے ہیں۔

ہوتا ہے، خواہ کتاب کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو۔ ایک استاد کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ دو اہم ترین کام ہیں جو میں کرسکتا ہوں۔ پہلا تو یہ کہ میں اپنے علم کو اپنے طالب علموں تک پہنچا دوں، مگر اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ طالب علموں تک اپنے شکوک اور Skepticism کو بھی پہنچا دوں اور ان کے لیے ایک چیلنج پیدا کردوں کہ وہ تحقیق بھی جاری رکھیں، مطالعہ بھی اور اس کے ساتھ سوالات بھی اٹھاتے رہیں۔ جس وقت وہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مجھے سن رہے ہوں، مجھ سے تبادلۂ خیال

پہلی قسط

دانش وروں کا رول

ایڈورڈ سعید

انگریزی سے ترجمہ: صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز

ایک سوال جو سارے استادوں اور طالب علموں کے سامنے رہتا ہے وہ ہے سیکھنے اور اختیار حاصل کرنے کے رول کو سمجھنے کا۔ اس رول کے بارے میں انھیں کسی الجھاؤ میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ میرے خیال میں علم کی جستجو، جس کا موقع یونیورسٹی، استادوں اور طالب علموں کو فراہم کرتی ہے، اُسے کسی کو اپنا اختیار استعمال کرکے نافذ نہیں کرنا چاہیے۔ پروفیسر یا استاد جن کے پاس اختیار ہوتا ہے ان کے لیے یہ سب کچھ طالب علموں کو محض سبق رٹانے، گھول کر پلانے والا معاملہ نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ علم کی جستجو یونیورسٹی کے اندر بھی اور اس سے ہٹ کر باقی زندگی بھر کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش و تحقیق اور لاانتہا تگ و دو، ہر شخص کا ایک ذاتی فریضہ ہے۔ یہ نہ کوئی استاد بس ایک بار ہمیشہ کے لیے عطا کرسکتا ہے، نہ کتابوں کے پڑھنے سے حاصل

کریں اسی وقت وہ یہ بھی کہہ رہے ہوں کہ سعید کی باتوں میں وہ کیا کچھ ہے جو غلط ہے۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ہم اس سے بھی آگے کیسے جاسکتے ہیں؟ اور اسی لیے ایک بات جو استاد کو بالکل آخر میں ٹھہر کر کہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ تمھیں دیا ہے وہ عارضی اور بس وہ ہے جو فی الحال میرے علم میں ہے۔ اس سے آگے کا کام تمھیں کرنا ہے، مگر بس یہی کافی نہیں ہے۔ تمھارا سوال یہ ہونا چاہیے کہ "میں اس علم میں کیا اضافہ کرسکتا ہوں؟" مجھے اس علم سے کیا کچھ لازماً حاصل کرنا چاہیے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اپنے استاد سے جتنا کچھ حاصل کیا ہے اس پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس علم کو اپنا کر اس پر اپنا نقش ثبت کرنا چاہیے۔

چناں چہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو خیال آپ تک پہنچا ہے اس سے اور آگے نکل جائیں اور اس خیال

تک پہنچیں جس کو خود آپ نے اپنی بہترین کوششوں سے خلق کیا ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ آج کے مشکل وقتوں میں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ یونیورسٹی سماج کا حصہ تو ہے مگر سماج کے مخصوص مسائل کا یہ حل نہیں ہے۔ ہندستان میں یا دنیا کے اس حصے میں جہاں سے میرا تعلق ہے، یعنی مشرق وسطیٰ میں یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں میں رہتا ہوں اور پڑھاتا ہوں، بے شمار سماجی مسائل ہیں۔ مفلسی کے مسائل، نسل سے متعلق مسائل، تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل اور معاشی ناانصافی کے مسائل۔

حصول علم کے مرکز کی حیثیت سے یونیورسٹی وہ مقام نہیں ہوسکتی جہاں یہ سارے مسائل حل کردیے جائیں۔ استاد کی حیثیت سے ہمیں کلاس روم کو یا لکچر ہال کو سماجی مسائل کے حل کے لیے استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیے، مگر دوسری

طرف یونیورسٹی سماج کی فرارگاہ بھی نہیں ہے۔ تمام جھگڑے یونیورسٹی میں نمٹائے بھی نہیں جاسکتے۔ نہ استاد اور طالب علم کی حیثیت سے ہم خود کو دنیا سے الگ تھلگ کرسکتے ہیں۔ یونیورسٹی میں شہریت کے امکانات کا بھرپور مطالعہ کرتے ہیں مگر سماجی مسائل کے حل کی ضرورت کے پیدا کیے ہوئے ہر قسم کے دباؤ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔

ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں، ناانصافی کی تاریخ کو جانیں، نسلی کشمکش کی حیثیت اور تاریخ سے واقفیت حاصل کریں، خیالات کی حیثیتوں اور مقامات سے آگاہ ہوں۔ انسان دوست خیالات، سائنسی خیالات اور سماجی خیالات، یہ سب کہاں سے آتے ہیں، یہ کس طرح نمائندگی کرتے ہیں اور کس شخص کو ان کی جانب کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے، وہ اختیار کرسکتا ہے۔ یونیورسٹی ایک ایسی جگہ ہے جہاں خیالات

پیش کیے جاسکتے ہیں، جہاں مکالمہ ہوسکتا ہے، جہاں دوسروں کے خیالات کے احترام کے ساتھ ساتھ تبادلۂ خیالات بھی جاری رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کے خیالات کو مان لیں۔ ان سے شدت کے ساتھ اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی ہی وہ جگہ ہے جہاں یہ سب کچھ ہوسکتا ہے اور یہی فضا استادوں اور طالب علموں کو صحیح معنوں میں شہریت کے لیے تیار کرتی ہے۔ ذمے داریاں، شان و شوکت، مشکلات اور مستقبل کی امیدیں سب اسی ماحول میں پلتی بڑھتی ہیں۔

مدتوں سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ دانش وروں کا کام ہلچل پیدا کرنا، سوالات کرنا اور وہ باتیں اٹھانا ہے جو کوئی اور نہیں کہے گا۔ ان میں جرأت ہونی چاہیے کہ ان تسلیم شدہ اور جانی بوجھی باتوں سے آگے جائیں جن کو مان کر ہم میں سے زیادہ تر لوگ انھی کے درمیان

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

متوازی ہندی سینما

تیسری اور آخری قسط

اسیم کاویانی
فلیٹ نمبر 702، کیتن اپارٹمنٹ
بلویڈر روڈ، مجگاؤں، ممبئی-10
E-Mail: aseemkavyani@gmail.com

اسی طرح ہماری بیورو کریسی کی لال فیتہ شاہی اور قابلیت و صلاحیت کی بے قدری کو موضوع بنا کر ڈائرکٹر تپن سنہا نے 1990ء میں فلم 'ایک ڈاکٹر کی موت' بنائی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اپنی گرہستی کے ذکر سے بھول کر جذام کے علاج کی تلاش میں اپنی زندگی وقف کر دینے والے ڈاکٹر (پنکج کپور) کو اپنی تحقیق اور اپنے حق کی لڑائی میں کتنی جانکاہی سے گزرنا پڑتا ہے۔

ظلم، ناانصافی اور حالات کا جبر انسان کو کس طرح مشتعل اور تشدد آمادہ کر دیتا ہے اسے 'مرگیہ' (1976ء)، 'آکروش' (1980ء) اور 'اردھ ستیہ' (1983ء) میں بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ مرنال سین کی 'مرگیہ' میں بھگوتی چرن پانی گرہی کی کہانی برٹش نوآبادیات کے عہد کے اڑیسہ کے سنتال قبائلی علاقے میں گردش ہوتی ہے، جس میں سنتال قبیلے کا ایک شکاری اپنی بیوی کی عزت بچانے کے لیے اپنے علاقے کے بدنام اور حریص مہاجن کا سر کاٹ دیتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اسے اپنے علاقے کے سب سے خطرناک 'درندے' کا سر اتارنے کا انعام سرکار بہادر سے ملے گا۔ لیکن سزا یاب ہوتا ہے۔ قبائلی اور اس کی بیوی کے کرداروں سے متھن چکرورتی اور ممتا شنکر نے اپنی اداکاری کے کریئر کا آغاز کیا تھا۔ آگے چل کر کمرشیل سینما میں ڈسکو ڈانسر بن جانے والے متھن کی زندگی کی غالباً یہ بہترین فلم تھی۔ بنگلہ کے سینما ٹوگرافر گووند نہلانی نے اپنی ہدایت کاری کے نقش اول 'آکروش' ہی سے اپنی مثالی مہارت کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔ بھیونڈی شہر کی ایک حقیقی واردات پر مبنی یہ کہانی وجے تیندولکر نے لکھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک قبائلی (اوم پوری) اپنی نوبیاہتا بیوی (سمیتا پاٹل) کو اس لیے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی عزت جنگل کی سیر پر نکلے کچھ رئیسوں اور سیاست دانوں نے لوٹ لی تھی اور وہ ان اونچی ہستیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا جن کے ساتھ اس کا آجر اور پولس والے بھی ملے ہوئے تھے۔ دوران مقدمہ اپنے باپ کی چتا جلانے کے لیے پیرول پر رہا قبائلی اپنی جوان بہن کو بھی اس خدشے سے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ کہیں مجبوری آئے اس کے آجر کی داشتہ نہ بنا دے۔ اپنی پہلی ہی فلم میں زبردست اداکاری نے اوم پوری کو اسٹار بنا دیا تھا۔ لیکن نہلانی کی بہترین فلم 'اردھ ستیہ' ہے، جس میں ایک ایماندار سب انسپکٹر (اوم پوری) کو جرم اور سیاست کے گٹھ جوڑ سے اس لیے متنفر بتایا گیا ہے کہ وہ اسے بار بار اپنے فرائض کی ادائیگی میں حائل پاتا ہے۔ اس کی بے بسی اور بے چینی کی انتہا نہیں رہتی جب اسے ایک ایسے سیاسی لیڈر (سداشیو امراپورکر) کی حفاظت پر مامور کیا جاتا ہے جس کے گناہوں کا گھناؤنا ماضی اس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح روشن تھا۔ بالآخر وہ اس سیاسی لیڈر کو قتل کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دیتا ہے۔

سعید اختر مرزا کی 'البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے' (1980ء)، 'سلیم لنگڑے پہ مت رو' (1989ء) اور ڈائرکٹر وجے مہتا کی 'پیسٹن جی' (1987ء) جیسی فلموں کی مخصوص پس منظر کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ایک طرح سے بیسویں صدی کے ہندوستان میں ان فرقوں کے عمومی حالات، مزاج، معاش اور موڈ کا علامتی اظہار بن گئی ہیں۔ پہلی کہانی کیتھولک فرقے کے تیز مزاج نوجوان گیرج مکینک البرٹ پنٹو (نصیر الدین شاہ) اور اس کی محبوبہ اسٹیلا (شبانہ اعظمی) کے گرد گھومتی ہے جب کہ سلیم لنگڑے (پون ملہوترا) کی کہانی میں بقول ڈائرکٹر یہ بتایا گیا ہے کہ بمبئی کے اوسط درجے کے مجرموں کے کنٹرول میں بسے علاقے (دونگری) میں ایک ملازمت پیشہ شخص کے زندگی بسر کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ 'پیسٹن جی' کے مرکزی کرداروں میں دو مسن پارسی دوست (نصیر الدین شاہ، انوپم کھیر) ان کی منتشر کر محبوبہ (شبانہ اعظمی) اور ایک بیوہ (کرن کھیر) شامل ہیں۔ ان فلموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان فرقوں کے ماحول اور معاشرت کو جیتا جاگتا سلولائیڈ پر پیش کر دیا گیا ہے۔

یوں تو مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب سے متعلق بے شمار فلمیں (نجمہ، طلاق، پاکیزہ، میرے محبوب وغیرہ) بنتی رہی ہیں لیکن ایم ایس ستھیو کی 'گرم ہوا' (1973ء)، بی آر چوپڑا کی 'نکاح' (1982ء) اور ساگر سرحدی کی 'بازار' (1982ء) جیسی فلموں کو ایک خاص پہلو سے مسلم معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور ازدواجی رخ کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی قابل تقلید کوششوں میں گنا جا سکتا ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے پر مبنی 'گرم ہوا' میں تقسیم وطن کے فوراً بعد منقسم مسلم خاندانوں کے کرب اور بدلے حالات میں ہم وطنوں کے بدلے ہوئے رویوں کے بیچ ان کی اپنی بقا کی جدوجہد میں پریشانیاں، شمالی ہند کے ایک جوتا ساز خاندان کی کہانی کے حوالے سے اس خوبی سے پیش کی گئی ہے کہ آپ ان موسموں کی گرم ہوا کی تپش محسوس کر سکتے ہیں۔ اچلا ناگر کی لکھی ہوئی کہانی پر مبنی 'نکاح' میں مسلم فیوڈل کلاس میں عورت کی حیثیت اور مسلم پرسنل لا کے مسائل (نکاح، طلاق اور حلالہ) کو پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ ساگر ہی کی لکھی کہانی 'بازار' میں حیدرآباد میں جوڑے اور جہیز کی بدعت کی مار جھیلتے متوسط طبقے کی کم تعلیم یافتہ بن بیاہی لڑکیوں کی بدحالی اور جاگیری سماج یا عرب شیوخ کے ذریعے ان کے استحصال کی دل دوز داستان پیش کی گئی ہے۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، پھر بھی ان فلموں کے اہم ترین کرداروں میں بالترتیب بلراج ساہنی، سلما آغا اور سپریا پاٹھک کی بے داغ اور لاجواب اداکاری کا اعتراف ضروری ہے۔ 'نکاح' میں حسرت کی غلام علی کی گائی ہوئی غزل 'چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے' اور سلما آغا کی دل ربا آواز میں حسن کمال کا کلام (1) 'دل کے ارماں آنسوؤں میں...' (2) 'دل کی یہ آرزو تھی کوئی...' اسی طرح 'بازار' میں خیام کی موسیقی کے ساتھ میر، مرزا شوق، مخدوم اور بشر نواز کا کلام لتا منگیشکر، جگجیت سنگھ، چترا سنگھ، طلعت عزیز اور بھوپیندر کی آوازوں میں غالباً اپنے بہترین غنائی فارم میں محفوظ ہو گیا ہے۔

ہندی فلم صنعت کی راج دھانی ممبئی میں خود ممبئی کی زمین آسمان میں سیکڑوں فلمی کہانیوں کو پھیلایا گیا ہے، لیکن کبھی کبھی ممبئی خود اپنے پھیلتے ہوئے موضوعات (رہائش، فسادات اور شرنارتھی) کی بنا پر بھی مرکزی موضوع بن کر ابھرتی رہی ہے۔ یہاں ایسی ہی چند فلموں کا تذکرہ مقصود ہے۔ خواجہ احمد عباس کی پرانی فلم 'شہر اور سپنا' کا بنیادی موضوع ہی ممبئی میں رہائش کا مسئلہ تھا۔ فلم میں پنجاب سے روزگار کی تلاش میں ممبئی آئے ایک نوجوان (دلیپ راج) کو اپنی بیوی (سریکھا) کے ساتھ پانی کے ایک سوکھے پائپ میں زندگی گزارتے دکھایا گیا ہے۔ فلم کے اختتام پر ایک طرف انہدامی دستے کو جھگی جھونپڑیاں اجاڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور دوسری طرف پائپ میں نوجوان کی بیوی ایک ننھے وجود کو جنم دے رہی ہوتی ہے۔ سلم (slum) کے موضوع کو زیادہ فنکاری کے ساتھ آنند پٹوردھن نے اپنی مشہور ڈاکیومنٹری 'ہمارا شہر' (1988) میں پیش کیا تھا۔ جس میں اسی کی دہائی میں ممبئی کی سلم آبادی پر بلڈر مافیا اور سیاست دانوں کے گٹھ جوڑ کے خطرے کو موضوع بنایا گیا تھا۔ فلم کے ایک منظر میں میونسپل کمشنر کو ممبئی میں رہائش کے لیے زمین کی قلت کی بات کرتے ہوئے بتایا گیا ہے جب کہ اسی وقت اس کے وسیع و عریض لان پر اس کا پالتو کتا دوڑتا کھیلتا نظر آتا ہے! ایک دوسرے منظر میں پولس کمشنر اور ڈائرکٹر کلب میں جھونپڑوں میں رہنے والے ان غریبوں اور مزدوروں کو بے عقل اور بے حیثیت کہتا ملتا ہے، جنھوں نے سمندر کے کنارے فلک بوس عمارتوں کو اپنا خون پسینہ ایک کر کے تعمیر کیا تھا جبکہ ساحل پر بنی ان کی جھگیاں ہمیشہ سمندر کی تیز و تند لہروں کی زد پر رہی تھیں! ڈائرکٹر سدھیر مشرا کی 1991ء میں ریلیز ہوئی فلم 'دھاراوی' ہمیں بتاتی ہے کہ ایسی آبادیوں میں معاشی مجبوریاں اور مسائل کی تلخیاں لوگوں کو کس طرح جرم کے پھندوں میں پھنسا دیتی ہیں۔ ڈائرکٹر میرا نائر نے اسکرپٹ رائٹر سونی تاراپور والا کے ساتھ مل کر گردو ماتنگ، گندی بستیوں، فٹ پاتھوں، کوٹھوں اور یتیم خانوں میں زندگی بسر کرتے بچوں کے حالات کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس دوران انھیں پولس، دلال، کوکین فروش، رنڈیوں سب ہی سے سابقہ پڑا تھا۔ انھوں نے انھیں بچوں کو چن کر 1980ء میں 'سلام بمبئی' بنائی تھی، جس میں ایسے بچوں کے سکھ دکھ، لڑائی جھگڑوں، بکھروں کو ان کی امنگوں، محرومیوں اور فرسٹریشن کو بڑے ہی دل چھو لینے والے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

آنند پٹوردھن کی فرقہ واریت کے خلاف پہلی تخلیقی ڈاکیومنٹری فلم 'یاد بہاری' کافی سراہی گئی تھی۔ دوسری 1992ء میں بنی ان کی ایک اہم ڈاکیومنٹری فلم 'رام کے نام' برسوں کی صبر آزما کوششوں اور عدالتی فیصلے کے بعد ریلیز ہو سکی تھی۔ اس میں ایودھیا کے مسئلے کے سیاسی استحصال، بھاجپا کے سیاسی ایجنڈے اور اڈوانی کی رتھ یاترا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس فلم میں ایودھیا کے اس پروہت کا بیان بھی شامل ہے جو فرقہ پرستوں کا شریک نہ بننے کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا اور اس کار سیوک کا انٹرویو بھی شامل ہے، جس نے پولس کے ساتھ مل کر عبادت گاہ میں مورتیاں رکھی تھیں۔ 1995ء میں ڈائرکٹر منی رتنم کی مشہور فلم 'بومبے' ریلیز ہوئی تھی، جس میں بتایا گیا ہے کہ انٹرکاسٹ شادی کرنے کی پاداش میں ایک جوڑا (اروند سوامی، منیشا

گوڑاؤ) اپنے اپنے خاندان سے نکال دیے جانے کے بعد معاش کے لیے بمبئی میں آکر آباد ہوجاتا ہے۔ ایسے میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد رونما ہونے والے فسادات میں میاں بیوی اپنے جڑواں بیٹوں کو کھو بیٹھتے ہیں۔ فلم کے اختتام میں نہ صرف وہ اپنے بیٹوں کو پالیتے ہیں بلکہ دل خوش کن طور پر فسادات کے روح فرسا سانحوں کو دیکھ کر ان کے خاندان بھی اپنی تنگ نظری کی دیوار گرا دیتے ہیں اور انھیں اپنا لیتے ہیں۔ اسی سال بابری مسجد کے انہدام کے سانحے کے پس منظر میں سعید اختر مرزا کی فلم 'نسیم' بھی آئی تھی، جس کی کہانی متوسط طبقے کے ایک مسلم خاندان کی نوعمر اسکول کی طالبہ نسیم (میوری کانگو) کے گرد گھومتی ہے۔ اسے اپنے بیمار اور اپاہج دادا (کیفی اعظمی) سے بڑا لگاؤ ہے، جو اسے قبل آزادی کی میل ملاپ اور انسان دوستی کی اچھی اچھی کہانیاں اور نظمیں سنایا کرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کہ گھر کے افراد ٹیلی ویژن پر رتھ یاترا کے ایودھیا پہنچنے کی خبروں سے فکرمند اور متوحش نظر آتے ہیں اور خود نسیم کا بھائی (سلیم شاہ) محض فساد کے اندیشے سے کچھ بنیاد پرستوں سے جا ملتا ہے۔ اپنے دادا سے ذہنی قربت رکھنے والی نسیم خود کو ایک عجیب سے دوراہے پر پاتی ہے۔ فلم کے اختتام میں ٹیلی ویژن پر بابری مسجد کے انہدام کی خبروں کے ساتھ اس کے دادا کی سانسوں کا تار بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ موت ایک مشترکہ کلچر کے خاتمے کی علامت بنی نظر آتی ہے۔

مشہور فلم جرنلسٹ اور نقاد خالد محمود کی کہانی پر شیام بینیگل نے 'ممّو' بنائی تھی۔ اس کہانی میں بمبئی میں بسے شرنارتھیوں رفیوجی مہاجروں کو پاکستانی قرار دے کر اپنی سیاست چمکانے والی ایک تنگ نظر علاقائی پارٹی شیو سینا کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ لاہور سے اپنی بہن کے پاس بمبئی میں ملنے کے لیے آئی بیوہ اور بے سہارا ممّو (فریدہ جلال) کوشاں ہے کہ کسی طرح یہاں کی شہریت مل جائے تو وہ اپنی زندگی کے باقی دن یہیں کاٹ لے، لیکن علاقائی پارٹی کی سیاست اسے واپسی پر مجبور کردیتی ہے۔ غالباً فریدہ جلال کے کریئر کی یہ بہترین فلم رہی ہے۔

2007ء میں ڈائرکٹر راہل ڈھولکیا نے گجرات کے مودی فسادات کے دوران ایک پارسی بچے اظہر مودی کے گم ہونے اور پھر نہ ملنے کی حقیقی واردات پر مبنی ایک فلم 'پرزانیا' پیش کی تھی۔ جس میں بچے کے پارسی والدین (جو نصیر الدین شاہ اور سارِکا بنے تھے) پر گزری تمثیل کے حوالے سے گجرات کے ہزاروں مسلمانوں پر بیتے درد و کرب کو اس موثر طریقے سے پیش کیا گیا تھا کہ شبنم ہاشمی کی 'انہد' نے اسے ان فسادات کے خلاف ہم وطنوں کا ضمیر بیدار کرنے کے لیے اپنی مہم کا حصہ بنالیا تھا۔ اس سلسلے میں تقسیم ہند کے خونچکاں پس منظر میں لکھے بھیشم ساہنی کے مشہور ہندی ناول 'تمس' پر بنے اسی نام کے ٹی وی سیریل کا ذکر بھی ضروری ہے، جسے بعد میں 1987ء میں فلم کی صورت میں بھی پیش کیا گیا تھا اور جس میں سیاست کے کریہہ اور ہولناک کردار اور اس کی پیدا کردہ ہر خوں ریزی اور تباہی کے مقابل انسانیت کے درد مند اور مہربان وجود کو اپنی بقا کی جنگ میں کوشاں بتایا گیا ہے۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ ہمارے دیش کی اور تحریک آزادی کی سب سے بلند مرتبت شخصیت گاندھی جی پر ہم ان کے شایانِ شان کوئی فلم نہ بناپائے۔ آخر ڈائرکٹر رچرڈ اٹن برگ نے 1982ء میں ان پر اپنی شاہکار فلم 'گاندھی' پیش کی۔ جس میں کسی ہندستانی نے نہیں بلکہ ایک انگریز بین کنگسلے نے گاندھی کا کردار اس طرح ادا کیا کہ حق ادا کردیا۔ کیتن مہتا نے سردار ولبھ بھائی پٹیل پر بالخصوص ان کے آخری پانچ برسوں کے تعلق سے ایک معیاری فلم 'سردار' 1993ء میں بنائی تھی، جس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سردار اور نہرو کے درمیان بعض اوقات سنگین اختلافات رونما ہوتے رہے تھے، لیکن گاندھی جی کی موت کے بعد انھوں نے مل جل کر کام کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہاں ایک شکایت کا اظہار کیے بنا رہا نہیں جاتا کہ آج تک مولانا ابوالکلام آزاد پر 'گاندھی' اور 'سردار' کے پایے کی فلم بنانے کا کسی کو خیال نہیں آیا جو کسی بھی طرح ان سے کم اہمیت کے حامل نہیں۔

ڈاکٹر وی کورین (جن کا پچھلے سال 90 برس کی عمر میں انتقال ہوا) نے آنند کے نواح میں کوآپریٹو تحریک کی بنیاد ڈالی تھی اور ان ہی کی سربراہی میں جدید ٹکنالوجی سے دودھ کی پیداوار کے فروغ کے لیے 1965ء میں ڈیری ڈیولپمنٹ بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ان کے سفید انقلاب سے امول برانڈ کو ملک گیر شہرت ملی۔ ایک بار جب کورین شہری بالائی طبقے کو فائدہ پہنچانے کے الزامات میں گھر گئے تو انھوں نے شیام بینیگل سے (1976ء میں) فلم 'منتھن' بنوائی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کی تحریک سے قبل گجرات کے کسانوں کو بااثر طبقہ، دلال اور مہاجن کس طرح لوٹ رہے تھے اور ان کی تحریک نے اتحاد، یک جہتی اور امداد باہمی سے کس طرح ان کی زندگیوں کا نقشہ بدل دیا۔ اس فلم کی کہانی کا خاکہ کورین اور بینیگل نے مل کر تیار کیا تھا اور اس میں گریش کرناڈ نے ڈاکٹر کورین کا کردار ادا کیا ہے۔ فلم میں بینیگل کی ٹیم کے منجھے ہوئے اداکار شامل ہیں اور سمیتا پاٹل نے کہانی کی ضرورت کے مطابق جمالیاتی لمحے فراہم کیے ہیں۔ فلم کے لیے پریتی ساگر کا گایا ہوا گیت 'مارو گام کاٹھا پارے' بہت مقبول ہوا، جو ان کی بہن نیتی ساگر نے لکھا تھا۔ اس فلم کے لیے ناکافی فنڈ کو دیکھ کر گجرات کوآپریٹو ملک فیڈریشن لمیٹڈ کے پانچ لاکھ کسان ممبروں نے دو روپے فی کس کے حساب سے دس لاکھ روپے فراہم کیے تھے۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی اور بین الاقوامی فلم فیسٹیول میں پہنچی تو امول برانڈ کو عالمی شہرت حاصل ہوگئی۔

1986ء میں اودھ کی تہذیب کے پروردہ اور عاشق مظفر علی نے اپنی فلم 'انجمن' میں لکھنؤ کی چکن دوزی کی صنعت کے مائل بہ زوال المیے کو اور ڈاکٹر شیام بینیگل نے 'سسمن' میں پوچم پلی (آندھرا پردیش) کی ریشم سازی کی ہینڈلوم صنعت کے مسائل اور جدید ٹکنالوجی سے مسابقت کے بحران کو پیش کیا تھا اور ناظرین کو یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی تھی کہ دست کاری میں فنکار کی روح کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔

ہندستانی کلاسیکی سنگیت کی مختلف قسموں اور ان کے فنکاروں پر بھی کئی قابل تعریف چھوٹی بڑی فلمیں بنائی گئیں، جنھیں عام فلموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً کمار ساہنی نے اٹھارہویں صدی کے ایک خاص طرز موسیقی 'خیال' پر اپنے حسن تخیل کو 'خیال گاتھا' (1988ء) میں پیش کیا تھا۔ رزمیے کی طرح اس کا تاریخی پس منظر فراہم کرنے کے لیے جہاں انھوں نے روپ متی باز بہادر، ہیر رانجھا، اور نل دمینتی جیسے تاریخ سے زیادہ افسانہ بن جانے والے کرداروں کی جھلکیاں پیش کی تھیں وہیں گوالیار گھرانے کے وارث فنکاروں کرشنا راؤ شنکر پنڈت، شرت چندر اروکر، جل بالا پوریا اور نیلا بھاگوت کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ منی کول نے 1982ء میں شمالی ہند کے مشہور طرز موسیقی 'ڈھرپد' پر اسی نام سے ڈاکیومنٹری فلم بنائی تھی جس میں دھرپد کی وراثت کا امین ڈاگر خاندان (ضیا محی الدین ڈاگر، ضیا فریدالدین ڈاگر) بھی ان کا شریک تھا۔ کول نے 1989ء میں 'سدھیشوری' کے نام سے بیسویں صدی کی کلاسیکی ٹھمری کی بنارس گھرانے کی غیر معمولی گائکا سدھیشوری دیوی (1903-77) کی زندگی کے افسانے کو بھی سلولائیڈ پر اتارا تھا۔ اسی طرح ملکۂ غزل بیگم اختر عرف اختری بائی فیض آبادی کی زندگی کے نشیب و فراز کو شیام بینیگل نے افسانوی انداز میں اپنی نجی فلم 'سرداری بیگم' (1996) میں پیش کیا تھا، جس میں کرن کھیر کی جان دار اداکاری نے بیگم اختر کو جیتا جاگتا سامنے لاکھڑا کیا تھا۔

کچھ ایسی منفرد اور دل چسپ فلمیں بھی ہیں جنھیں کسی خانے میں فٹ نہیں کیا جاسکتا، مثلاً ایک راجستھانی لوک کہانی پر مبنی منی کول کی 'دوویدھا' (1973ء) میں ایک نوبیاہتا دلھن پر ایک بھوت عاشق ہو کر اس کے شوہر کے لیے پریشانیاں کھڑی کردیتا ہے۔ اس دل چسپ کہانی کو امول پالیکر نے 2005ء میں 'پہیلی' کے نام سے اپنے ڈھنگ سے پیش کیا تھا۔ 'دوویدھا' میں شادی شدہ جوڑے کا کردار روی مینن اور ریکھا پرسی نے ادا کیا تھا اور 'پہیلی' میں شاہ رخ خان اور رانی مکھرجی نے۔ پھنیشور ناتھ رینو کی کسی لوک کہانی ہی کی طرح دل کش اور شمالی ہند کے کئی لوک گیتوں سے سجی ہدایت کار باسو بھٹاچاریہ کی ترنم ریز 'تیسری قسم' (1966ء) کو بھلا کون بھلا سکتا ہے! جس میں سادہ دل گاڑی بان ہیرامن (راج کپور) اور اس کی گاڑی کی سواری مسافر نوٹنکی ڈانسر (وحیدہ رحمان) کے درمیان گیت و سنگیت کی ہم مذاقی کے علاوہ چند روز کی رفاقت دھیرے دھیرے ان دونوں کے دلوں میں ایک عجیب سا رشتہ ایثار پسندی تک کا پیدا کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نوٹنکی ڈانسر اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ شہر کے لیے چل پڑتی ہے تو دل شکستہ ہیرامن اپنی زندگی کی تیسری قسم یہ کھاتا ہے کہ وہ پھر کسی نوٹنکی گرل کو اپنی بیل گاڑی میں نہیں بٹھائے گا۔ ایک سنسکرت ڈرامے (مرچھکٹیکا) پر 'اتسو' (1984ء) کا ایک اپنا ہی رنگ تھا جس کے لیے ہدایت کار گریش کرناڈ نے ایک عجیب سا طلسماتی ماحول تخلیق کیا تھا۔ ہدایت کار سنگیتم نواس راؤ نے بغیر مکالموں کی فلم 'پشپک' میں اپنی یہ انوکھی کہانی پیش کی تھی کہ ایک بے روزگار نوجوان (کمل حسن) ایک شرابی رئیس کو کہیں نشے میں دھت پڑا پاتا ہے، جس کی جیب میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی چابی جھانک رہی تھی۔ نوجوان اسے اٹھا اپنے گھر میں لاکر قید کردیتا ہے اور اس کی جگہ فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچ کر مزے اڑاتا ہے، اس بات سے بے خبر کہ کوئی کرایے کا قاتل اس کمرہ نمبر کے مکین کو قتل کرنے کے ارادے سے پہنچے گا۔ مرنال سین کی 'ایک دن اچانک' (1988ء) میں ایک ریٹائرڈ پروفیسر ایک دن اچانک غائب ہوجاتا ہے۔ وہ نہیں لوٹتا تو اس کی بیوی بچے، دوست احباب فکر مند ہوجاتے ہیں۔ جب مہینوں گزر جاتے ہیں تو وہ سب اپنی اپنی یادوں کے اجزا سے اس کا جس طرح تصور کرتے ہیں، ڈائرکٹر نے انھیں جوڑ کر اس کی شخصیت کی تعمیر کی کوشش کی ہے۔ کچھ فلمی نقادوں نے اس فلم کو سین کی سب سے قریبی سوانحی فلم کے طور پر دیکھا ہے۔ 1976ء میں ڈائرکٹر ڈی ایس سلطانیا کی پیش کی گئی فلم 'کتنے دور کتنے پاس' میں اس نام پر منطبق ہونے والی دو الگ الگ کہانیاں یکجا تھیں جو کہ انٹرول میں منقسم ہوجاتی ہیں۔ پہلی کہانی کے کردار سمیت بھابھا اور حنا کوثر نے نبھائے تھے اور دوسری کہانی میں ایک مٹی ہوئی جاگیردارانہ تہذیب کے وارث اور گھوڑوں کی ریس کے شوقین رئیس کا کردار اسمٰعیل دت نے ادا کیا تھا۔

ڈائرکٹر بپلب رائے چودھری کی 'شودھ' (1980ء)، امول پالیکر کی 'ان کہی' (1984ء) اور گریش کرناڈ کی 'چیلووی' (1992ء) بنیادی طور پر کسی خاص پیغام کی حامل مقصدی فلمیں ہیں۔ 'شودھ' توہم پرستی کے خلاف گاؤں کے غریب اور ان پڑھ لوگوں کے ذہن سے بھوت پریت کے یقین کو ختم کرنے کے لیے بنائی گئی فلم تھی اور مرکزی رول اوم پوری نے ادا کیا تھا۔ 'ان کہی' کے ڈائرکٹر نے پیغام دیا تھا کہ علم ستارہ کیا تری تقدیر کی تحریر بدلے گا؟ اس فلم میں ایک اہم انجام کہانی کے ذریعے علم نجوم کو غیر عقلی اور ناقابل اعتبار ثابت کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار امول پالیکر، دیپتی نول اور شری رام لاگو نے ادا کیے تھے۔ تیلگو فلم 'چیلووی' کنڑ کی

(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

اردو میڈیم سرکاری مدارس کے مسائل کے حل کے لیے نمائندگی

حیدرآباد (۲۵ راپریل)۔ اردو میڈیم فیڈریشن آندھراپردیش نے اردو مدارس میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے اقلیتوں سے متعلق پندرہ نکاتی پروگرام کی عمل آوری کا مطالبہ کیا ہے اور اس سلسلے میں پرنسپل سکریٹری ثانوی تعلیم سے نمائندگی کی ہے۔ فیڈریشن نے وزیر اعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے مطابق اقلیتوں میں معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے رہنمایانہ خطوط پر عمل آوری کا مطالبہ کیا۔ اردو میڈیم سرکاری مدارس میں مفت نصابی کتب کی فراہمی کی مانگ کی گئی۔ نصابی کتب تعلیمی سال کے آغاز کے ساتھ ہی طلبہ کو فراہم کیے جائیں تاکہ ان کی تعلیم میں کوئی خلل نہ ہو۔ حکومت کی جانب سے طلبہ کو جو یونیفارم فراہم کیے جاتے ہیں ان کا معیار انتہائی کمتر ہوتا ہے۔ فی طالب علم فی یونیفارم صرف 200 روپے منظور کیے جاتے ہیں۔ فیڈریشن نے حکومت سے درخواست کی کہ اس رقم کو فی یونیفارم 400 روپے کیا جائے تاکہ معیاری یونیفارم مہیا کیا جاسکے جو غریب طلبہ کے لیے دیرپا زیر استعمال رہے۔ حکومت نے طالبات کے لیے سائیکلوں کی فراہمی کی اسکیم کا اعلان کیا تھا لیکن اس پر حیدرآباد میں عمل آوری نہیں کی گئی۔ فیڈریشن نے گزشتہ سال حیدرآباد میں طالبات میں تقسیم کی گئی سائیکلوں کی تفصیلات جاری کرنے کی خواہش کی۔ فیڈریشن نے اردو مدارس کو درپیش دیگر مسائل بالخصوص اساتذہ کی خالی اسامیوں سے متعلق بھی ایک تفصیلی یادداشت پیش کی ہے۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

اردو مترجمین کے خالی عہدوں پر تقرری کا مطالبہ

لکھنؤ (۱۸ راپریل)۔ اردو بچاؤ تحریک کا جلسہ حسین گنج واقع شیروانی کوٹھی میں مسٹر ارشاد کی صدارت میں ہوا۔ جلسے کی نظامت محمد وسیم ندوی نے انجام دیا۔ اس موقعے پر تجویز منظور کرکے جامعہ اردو علی گڑھ کو اور بین اردو یونیورسٹی کا درجہ دینے کی حمایت کی گئی۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ۹ رجنوری اور ۱۱ رفروری کے سرکاری حکم نامے پر سختی سے عمل درآمد کرایا جائے جس میں بھی ضلع مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ۳۱ رمارچ تک اپنے اپنے اضلاع میں ۱۹۹۳ء سے خالی پڑے اردو مترجمین کے عہدوں کو مہم چلاکر پُر کیا جائے۔ جلسے میں کہا گیا کہ تقریباً 65 اضلاع میں اس ہدایت پر ابھی تک عمل درآمد نہیں ہوا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ بھی سرکاری عمارتوں مثلاً اسمبلی عمارت، شکتی بھون، جواہر بھون، باپو بھون وغیرہ میں بھی اردو میں بورڈ لگائے جائیں۔ جلسے کو ڈاکٹر ریحان علوی، منیر احمد، ریحان خاں، ذیشان، صالحہ بانو، خدیجہ بانو اور عبدالصمد وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

(آگ۔ لکھنؤ)

ریاستی قانون ساز اسمبلی و کونسل میں اردو مترجم کا عہدہ خالی

حیدرآباد (۱۸ راپریل)۔ ریاستی حکومت ایک طرف ان پندرہ اضلاع میں جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا موقف حاصل ہے، سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کے سائن بورڈز پر تلگو کے ساتھ اردو کو بھی شامل کرنے کے اقدام کررہی ہے لیکن صرف سائن بورڈ پر اردو کو شامل کردینے سے اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا موقف حاصل ہے ان اضلاع کے سرکاری دفاتر میں اردو درخواستوں کی وصولی کا کوئی نظم نہیں ہے اور نہ ہی کسی دفتر حتیٰ کہ کلکٹریٹ میں اردو آفیسر کا تقرر کیا گیا۔ اس سلسلے میں نہ ہی حکومت اور نہ ہی برسر اقتدار جماعت کے عوامی نمائندوں کو کوئی فکر ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جہاں اردو کو پندرہ اضلاع میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے قانون سازی کی گئی خود وہاں پر اردو کا حال دگرگوں ہے۔ ریاستی قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل میں اردو مترجم کا عہدہ خالی ہے، اس کے علاوہ اسمبلی کے ایجنڈے کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ اسٹاف موجود نہیں ہے بلکہ آؤٹ سورسنگ پر خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ۲۰۰۷ء میں قانون ساز کونسل کے احیا کے بعد سے وہاں پر اردو رپورٹر اور مترجم کا تقرر نہیں کیا گیا، اسی طرح گزشتہ دو سال سے اسمبلی میں بھی یہ عہدے خالی ہیں حالانکہ گزشتہ کئی برسوں سے اسمبلی میں ہر چیف منسٹر نے اردو عہدیداروں کی خالی اسامیوں پر تقررات کے سلسلے میں بارہا ہدایات دیے تھے۔ قانون ساز اسمبلی میں اردو کا ایک مترجم ہے جو آئندہ چند دنوں میں وظیفے پر سبکدوش ہوجائے گا جب کہ کونسل میں مترجم کی خدمات آؤٹ سورسنگ پر حاصل کی گئی ہیں۔ اسمبلی اور کونسل میں وزرا کے ناموں کی تختیوں کی تیاری کا کام کنٹریکٹ پر دیا جاتا ہے اور اردو میں تحریر کا کام بھی غیر اردو داں افراد کے ہاتھوں ہی ہوتا ہے جس کے باعث غلط املا کے ساتھ اردو تحریر کی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسمبلی میں صرف ایک اسسٹنٹ سکریٹری کا تعلق ہی اقلیتی طبقے سے ہے جب کہ حال ہی میں ایک اقلیتی شخص کو سیکشن آفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ حکومت پندرہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے دعوے تو کررہی ہے لیکن اس پر عمل آوری پر کوئی توجہ نہیں ہے۔ خود ریاستی سکریٹریٹ میں کسی بھی وزیر حتیٰ کہ چیف منسٹر کے دفتر میں اردو میں درخواستوں کی وصولی کا نہ کوئی نظم ہے اور نہ ہی اردو عہدیدار موجود ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد اعظم پورہ کے بورڈ پر اردو تحریر کے لیے نمائندگی

حیدرآباد (۲۶ راپریل)۔ اردو کے سلسلے میں چلائی جانے والی اردو کونسل کی سائن بورڈ مہم کے وفد نے جو سید مجتبیٰ عابدی، دوست علی، سید شکیل عابدی اور محمد مشتاق احمد پر مشتمل تھا، اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد اعظم پورہ برانچ کے بورڈ پر اردو کو بھی تحریر کرنے کے لیے تحریری یادداشت ملیجر مسٹر اے پی راما راؤ کو پیش کی۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہلِ قلم کی تحریریں

حیدرآباد۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں 'مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا ویسا پایا' اور 'مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ'۔

'مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا ویسا پایا' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگارنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر قمر رئیس، حنفی، نظر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفرالحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو 'جیسا دیکھا ویسا پایا' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعرا نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، احمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور تقی علی کے پُر مغز مضامین شامل ہیں۔

'مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ'، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، یوسف ناظم، اقبال متین، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر انور کمال، زاہد علی خان، منور حسن کمال، انور سدید، محمود سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، فرحت عباس، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں یہ باقاعدہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، علیہ فردوس اور کئی بار یک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت، طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہ دونوں کتابیں اردو طنز و مزاح کے فن پر ریسرچ کرنے والوں اور مجتبیٰ حسین کے پرستاروں کے لیے ایک نایاب تحفہ ثابت ہوں گی۔

اردو کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے استاد نہیں

گورکھپور (۲۸ راپریل)۔ سب کو تعلیم مہم کے تحت جونیئر ہائی اسکول نواس اور پرائمری ہائی اسکول پورولی کے اشتراک سے آج ایک ریلی نکالی گئی جس میں اسکول کے بچوں کے علاوہ اساتذۂ کرام اور بیسک تعلیم دفتر کے افسران بھی موجود تھے، جن میں پورولی علاقے کے اے بی ایس اے پی کے رائے پیش پیش تھے جنھوں نے جھنڈی دکھاکر ریلی کو روانہ کیا۔ اس موقعے پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر نصیرالدین نے کہا کہ 6 سال سے 14 سال کے بچوں کو تعلیم ان کے بنیادی حقوق میں شامل کردی گئی ہے اور تعلیم ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ اس موقعے پر پرائمری اسکول کی ہیڈ ماسٹر رشی خان نے کہا کہ سب کو مفت تعلیم کا اختیار حاصل ہونے کے بعد اساتذہ کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی ہے اور سماج کے دوسرے طبقے کی بھی، ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ اس موقعے پر گاؤں کی پردھان آرتی دیوی نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کا داخلہ کرائیں اور پورے سماج کو تعلیم یافتہ بنانے کا عہد کریں۔

چونکانے والی بات یہ تھی کہ اسکول

اردو اساتذہ کے ساتھ ناانصافیوں کے معاملے پر وزیر تعلیم سے ملاقات

اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی جانب سے 9 نکاتی عرض داشت پیش

علی گڑھ (۲۶ مارچ/اپریل)۔ اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن علی گڑھ ریجن کے ایک وفد نے صوبائی وزیر تعلیم (بیسک) رام گووند چودھری سے ملاقات کی اور انھیں 9 نکاتی عرض داشت پیش کی جس میں مقامی افسران کی جانب سے اردو اساتذہ کے ساتھ ہورہی ناانصافیوں اور بے ضابطگیوں سے واقف کرایا۔ عرض داشت میں اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے اسکولوں میں دوسرے مضامین کی طرح اردو کی کتابیں فراہم کرنے اور مذکورہ اسکولوں میں اردو ٹیچرس کی تعیناتی کو لازمی کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ علی گڑھ میں بیسک اور جونیر ہائی اسکولوں کے اساتذہ کو ۲۰۰۸ء سے اب تک پروموشن اسکیل دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ضلع پریشد کے اساتذہ کو ہر سال پروموشن اسکیل دیا جاتا ہے لیکن شہر کے 80 فیصد اردو اساتذہ ایسے ہیں جن کو اس سہولت سے محروم کردیا گیا ہے۔ عرض داشت میں مزید کہا گیا ہے کہ خواتین اساتذہ کی دور دراز علاقوں میں تعیناتی کردی گئی ہے جو سراسر غلط ہے، خواتین اساتذہ کو ان کی رہائش گاہ سے 15 کلومیٹر کے دائرے میں تعیناتی کی جائے۔ اردو اساتذہ کے تمام مسائل کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے صوبائی وزیر تعلیم بیسک رام گووند چودھری نے پرنسپل سکریٹری کو احکام جاری کیے ہیں کہ ضلع بیسک ایجوکیشن آفیسر فوری طور پر اردو زبان کی کتابیں دیگر مضامین کے ساتھ ہر اسکول میں جہاں بھی اردو پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں، بھجوائیں اور اردو اساتذہ کی تعیناتی کو یقینی بنائیں۔ وہیں شہر علی گڑھ کے اساتذہ کو 20 فیصد کے حساب سے ۲۰۰۸ء سے اب تک کا پروموشن اسکیل ادا کیا جائے۔ صوبائی وزیر نے وفد کو یقین دہانی کرائی کہ سماج وادی حکومت میں مسلم اقلیتوں کی پریشانیوں کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا، ان کے جو بھی مسائل ہیں ان کو ترجیحی بنیاد پر حل کیا جائے گا۔ وزیر موصوف نے مندرجہ بالا مسائل کو حل کرنے کے لیے ڈائرکٹر تعلیم بیسک کو بھی کہا ہے۔ وفد میں ریجنل صدر کنور نسیم شاہد، ضلع صدر گلزار احمد، ضلع سکریٹری ہاشم انصاری اور محمد ضلع الفقار وغیرہ شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

دوسری سرکاری زبان ہونے کے باوجود اردو میں درخواست لینے سے انکار

پٹنہ (۱۷ اپریل)۔ اردو کونسل ہند کے ناظم اعلا ڈاکٹر اسلم جاوداں نے اپنے ایک اخباری بیان میں حکومت سے سوال کیا ہے کہ کیا بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو نہیں ہے؟ کیوں کہ حکومت کے جس محکمے میں بھی اردو میں درخواست دی جاتی ہے وہاں اسے لینے سے انکار کیا جاتا ہے اور ہندی میں درخواست دینے کو کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فاربس گنج گولی کانڈ کی عدالتی جانچ کمیشن کو جب بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے جنرل سکریٹری محمد عارف انصاری نے اردو میں درخواست دی تو انھیں تحریری طور پر ہدایت دی گئی کہ کمیشن میں اردو پڑھنے کا نظم نہیں ہے لہٰذا آپ ہندی میں درخواست دیں تب ہی اس پر کارروائی کی جائے گی۔ ڈاکٹر جاوداں نے کہا کہ جب اقلیتوں کے سلسلے میں بنے جانچ کمیشن میں بھی اردو پڑھنے کا نظم نہیں ہے تو پھر اردو کا گزر کہاں ہوگا؟ انھوں نے بتایا کہ وزیر اعلا سکریٹریٹ میں بھی اردو میں درخواست لینے سے گریز کیا جاتا ہے اور ہندی ترجمہ طلب کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم ہندی ترجمہ کر ہی دیں گے تو اردو لکھنے کا مطلب کیا رہ جائے گا۔ یہ سراسر دوسری سرکاری زبان اردو کی سرکاری حیثیت کی نفی ہے۔ حکومت کو اس سلسلے میں ضروری ہدایت جاری کرنے کی ضرورت ہے ورنہ دوسری سرکاری زبان اردو صرف کاغذی بن کر رہ جائے گی۔

(آزاد ہند، کلکتہ)

اردو ٹیچر کے نہ ہونے سے طلبہ دوسری زبانیں لینے پر مجبور

نئی دہلی (۱۵ اپریل)۔ اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ دیگر اسکولوں میں تیسری زبان کے طور پر پڑھانے کے لیے جب اردو اساتذہ کی مانگ کی جاتی ہے تو مہینوں تک اردو اساتذہ کا انتظام نہیں کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً طلبہ تھک ہار کر سنسکرت یا کوئی دوسری زبان پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں نامہ نگار نے مغربی دہلی کے مختلف لوگوں سے ان کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

بابو خاں نے کہا کہ اردو زبان کو دوسری زبان کا درجہ دہلی سرکار نے دیا ہے اور کئی اداروں کو اردو کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے کروڑوں روپے ہر سال دیتی ہے مگر یہ ادارے صرف مشاعرے اور اعزازات سے نوازنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ ان اداروں کو چاہیے کہ اردو تعلیم کے راستے میں آنے والی دقتوں پر زیادہ توجہ دیں۔ روہنی کے حاجی عباس علی کا کہنا ہے کہ مہارانا پرتاپ باغ کے سنگم پارک میں واقع ایم سی ڈی پرائمری اسکول میں 30 برسوں سے اردو تعلیم دی جارہی تھی لیکن یہاں ہیڈ ماسٹر نے پہلی کلاس میں اردو تعلیم کا سلسلہ ختم کردیا۔ سراج الدین نے بتایا کہ رٹھالہ کے مہارانا پرتاپ گورنمنٹ گرلس اسکول میں ۲۰۱۲ء میں 23 لڑکیوں کا داخلہ ہوا تھا جنھوں نے دوسری زبان کے طور پر اردو لی تھی مگر ابھی تک اردو کا کوئی ٹیچر مقرر نہیں ہوا ہے۔

حاجی چاند میاں نے بتایا کہ سلطان پوری کے ای بلاک میں واقع سروودیہ بال ودیالیہ میں گزشتہ سال 230 طلبہ نے چھٹی کلاس میں داخلہ لیا اور دوسری زبان کے طور پر اردو زبان لینی چاہی، تو ان کا داخلہ صرف اس بنیاد پر نہیں لیا گیا کہ اس اسکول میں اردو پڑھانے والا کوئی ٹیچر نہیں تھا۔

محمد قاسم کہتے ہیں کہ دہلی سرکار نے مختلف ادارے اردو کے فروغ کے لیے قائم کیے ہیں، یہ ادارے اردو کے مستقبل کے لیے کیا کام کرتے ہیں، ان اداروں سے جواب کیوں نہیں طلب کیا جاتا۔ اسلام الدین صاحب نے بتایا کہ اگر ہم اردو کے تئیں واقعی فکرمند ہیں تو اپنے بچوں کو داخلے کے وقت دوسری زبان کے طور پر اردو ضرور دلائیں۔ سلیم الدین کہتے ہیں کہ دوسری زبانوں کو پڑھانے والے اساتذہ کو جو تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ اردو اساتذہ کو نہیں ملتیں۔ کیا یہ اردو اور اردو والوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ محمد عارف سیفی، محسن سیفی و دیگر لوگوں نے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

اردو کے تعلق سے اہم فیصلوں کے لیے ریاستی حکومت کی تعریف

لکھنؤ (۱۵ اپریل)۔ اردو بچاؤ تحریک نے اردو زبان کی اشاعت، ترویج کے لیے ریاستی حکومت کے ذریعے کیے گئے اقدام کی تعریف کرتے ہوئے وزیر اعلا اکھلیش یادو، ان کے کابینی وزرا، ایڈیشنل ایڈووکیٹ ظفریاب جیلانی، سابق ایڈووکیٹ جنرل ایس ایم کاظمی اور ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ واضح رہے کہ حکومت نے سرکاری دفاتر اور افسران کے ناموں کے کتبے ہندی کے ساتھ ہی اردو میں لگانے کا حکم جاری کیا ہے اور پی سی ایس جے میں اردو سے متعلق ایک سوال نامہ بھی بحال کیا ہے اسی طرح حکومت نے اردو مترجمین کی تقرری کا حکم نامہ جاری کرتے ہوئے معلم اردو سند یافتگان کی بطور اساتذہ تقرری کا بھی فیصلہ کیا اور اردو اکادمی کے نائب صدر کی نامزدگی کی۔ آج یہاں حسین گنج میں ہوئے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے تحریک کے جنرل سکریٹری ارشاد ربانی نے کہا کہ اردو کے حقوق کے لیے بارہ برسوں سے کوششیں جاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا خالد رشید فرنگی محلی، مولانا کلب جواد، مولانا ابوالعرفان میاں، مولانا فضل الرحمن واعظی، مولانا سلمان حسینی، مولانا عامر رشادی اور مولانا عالم رضا نوری وغیرہ کی حمایت کے ساتھ ہی جمعیۃ علما کے صدر مولانا ارشد مدنی کی ذاتی دل چسپی سے اردو کی فلاح و بہبود میں یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

(آگ، لکھنؤ)

◆◆◆

کے ہیڈ ماسٹر نصیر الدین نے بتایا کہ جونیر ہائی اسکول میں اس وقت 70 بچے ہیں جن میں سے 34 اردو کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح پرائمری اسکول کی رنی خاں نے کہا کہ اسکول میں 192 بچے ہیں، جن میں 80 بچے اردو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر جونیر ہائی اسکول یا پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر کی تقرری نہ ہونے کی وجہ سے اردو مضمون کی پڑھائی متاثر ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو میڈیم پرائمری اسکول کی نئی عمارت کا افتتاح

حیدرآباد (۱۹ اپریل)۔ محترمہ صبیحہ انجم صدر معلمہ گورنمنٹ پرائمری اسکول دودھ باولی کے بیان کے مطابق حج تقلب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی سے منظور شدہ عمارت گورنمنٹ پرائمری اسکول دودھ باولی اردو میڈیم بمقام آنند بستی بمت پورہ کا افتتاح عمل میں آیا۔ یہ اسکول مستقل جگہ نہ ہونے کی وجہ سے خانگی عمارتوں میں کام کررہا تھا۔ بار بار جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے طلبہ کے داخلے اور ان کی تعلیم پر اثر پڑ رہا تھا۔ مقامی قائدین اور جناب این سری نواس چاری (ڈپٹی آئی او ایس بہادر پورہ منڈل 2) کی خصوصی دل چسپی سے آنند بستی، بمت پورہ میں نئی تعمیر شدہ عمارت میں یہ اردو میڈیم اسکول منتقل کیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں مقامی قائدین، اہلیان محلہ، اساتذہ اور سرپرستوں نے شرکت کی۔

(سیاست، حیدرآباد)

شمس آباد اردو اسکول کو علاحدہ کرنے کے لیے
مرکزی وزیر کا ضلع کلکٹر کو مکتوب

حیدرآباد (۵ اپریل)۔ تعلیمی سال کے آغاز پر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے مختلف عہدیداروں بشمول ڈسٹرکٹ کلکٹر رنگاریڈی سے مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے تحریری نمائندگی کی گئی تھی کہ اردو میڈیم پرائمری رہائی اسکول کو تلگو میڈیم مینجمنٹ سے اسی تعلیمی سال سے علاحدہ کرتے ہوئے الگ ہیڈ ماسٹر فراہم کریں تاکہ غریب و متوسط طبقے کے مسلم بچوں کی تعلیمی حالت بہتر ہو اور اردو میڈیم میں زیر تعلیم طلبہ و طالبات کو مضبوطی و استقلال عطا ہوسکے۔ لیکن چند فرقہ پرست عناصر کی وجہ سے ابھی تک اس پر عمل نہیں ہوا اس لیے محمد مشتاق محی الدین (صدر مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن شمس آباد منڈل) نے ایک وفد کے ساتھ مرکزی وزیر سائنس و ٹکنالوجی ایس۔ جے پال ریڈی سے ملاقات کرتے ہوئے شخصی طور پر تحریری یادداشت پیش کی اور دوران ملاقات انھوں نے مرکزی وزیر کو اس بات سے بھی واقف کروایا کہ اردو میڈیم پرائمری رہائی اسکول شمس آباد تلگو میڈیم مینجمنٹ کے زیرنگرانی ہونے کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات کو صحیح تعلیم نہیں مل رہی ہے اور طلبہ و طالبات کی تعداد میں بھی کمی ہورہی ہے جب کہ اردو میڈیم اسکولوں کو علاحدہ کرنے کے لیے تمام سہولیات موجود ہیں جس سے تعلیم کے حصول میں اردو والوں کو آسانی ہوگی۔ مطالبے کو قبول کرتے ہوئے مرکزی وزیر ایس۔ جے پال ریڈی نے وہ علاحدہ علاحدہ مکتوب ضلع کلکٹر کو مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کی یادداشت کے ساتھ روانہ کیے اور ضلع کلکٹر کو کہا کہ جلد از جلد اردو میڈیم اسکولوں کو علاحدہ کرنے کے احکام جاری کریں تاکہ طلبہ و طالبات کو حصول علم میں آسانی ہوسکے۔

(منصف، حیدرآباد)

☆☆☆

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : نادیو (ناول)
مصنف : آنند لہر
ضخامت : ۱۵۲ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ناشر : اوشن پبلی کیشنز ۹۲۶، کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

شام سندر آنند جنھیں آنند لہر کے قلمی نام سے جانا جاتا ہے، اردو کے معروف فکشن نگار ہیں جو ۳/ جولائی ۱۹۵۱ء کو پونچھ (جموں و کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ بی ایس سی، ایل ایل بی کی تعلیم پائی، اس کے بعد جموں میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور اب وہیں پر اقامت پذیر ہیں۔ آنند لہر گیارہ تصانیف کے خالق ہیں جن میں افسانوی مجموعے (سرحد کے اس پار، انحراف، کورٹ مارشل)، ناول (اگلی عید سے پہلے، سرحدوں کے بیچ، مجھے کہا ہوتا، یہی سچ ہے، نادیو)، ڈرامے (نروان، تصویری کون) اور ریڈیائی ڈرامے (سرحدیں) شامل ہیں۔ آنند لہر کا پہلا افسانہ 'پتھر کے آنسو' ۱۹۷۲ء کے آس پاس کالج کے میگزین میں اس وقت چھپا تھا جب ادب پر جدیدیت کا دبدبہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنند لہر بھی اسی لہر میں بہہ گئے جو ان کی اکثر تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے اکثر محبت و بھائی چارے، مذہبی رواداری اور عالمی امن کی تلقین کرتے ہیں۔

'نادیو' ایک کرداری ناول ہے جس کا مرکزی کردار نادیو عمر بھر پیار اور محبت بانٹتا رہتا ہے۔ آنکھیں کھل جانے سے پہلے ہی اس کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ جاتا ہے جس کے باعث وہ اوڈیپس کامپلیکس (Oedipus complex)، ایذا پسندی (Masochism) اور فیٹشزم (Fetishism) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساوتری اور آشا میں اپنی ماں ڈھونڈتا پھرتا ہے اور جوان ہو کر ایک کے بعد ایک کئی لڑکیوں جیسے نسیم، نیرو اور ثنا، کے عشق میں دیوانہ ہو جاتا ہے مگر اسے ہر جگہ ناکامی ہاتھ لگ جاتی ہے۔ خوش رنگ اور خوش نما کپڑوں سے اس کا پیار بھی اسی نفسیاتی کجروی کی دین ہے۔ ناول سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ "نہ جانے نادیو کس طرح کا شخص تھا اور اس کا دل بھی عجیب تھا جو کئی خانوں میں بنا ہوا تھا۔ ایک خانے میں نیرو رہتی تھی، دوسرے میں ثنا، تیسرے میں آشا اور چوتھے خانے کے اندر طوطا رہتا تھا اور پھر نسیم تو اس کے لہو کے اندر بسی ہوئی تھی۔"

☆ "میں اس لیے رو رہا ہوں کہ ہر چیز کو کھونا میرا مقدر ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں کہیں تمھیں بھی کھو نہ دوں۔ اس لیے میں تمھیں پانا ہی نہیں چاہتا۔"

ناول میں نادیو کا پورا خاندان بکھر جاتا ہے جس میں اس کی ماں اور بڑی بہن بھگوان کو پیاری ہو جاتی ہیں، سوتیلی ماں کا دماغ پھر جاتا ہے، دوسری بہن کی ازدواجی زندگی باپ کے لالچ اور حرص کی نذر ہو جاتی ہے اور تیسری بہن آرتی جو اس ناول کی راوی بھی ہے کنواری رہ جاتی ہے۔ خود نادیو غداری کے الزام کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ ادھر پنجرے کا 'طوطا' جو قیدی انسان کا علامیہ بھی ہے پہلے اپنی پرواز کھو دیتا ہے، پھر اپنی آواز اور آخر کار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ بہر کیف ایک مثبت نتیجہ جو نادیو کی قربانی سے نکلتا ہے وہ یہ کہ دو پڑوسی گاؤں کی آپسی دشمنی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے اور نادیو ققنس کی طرح اس راکھ سے عشق و محبت کا مسیحا بن کر ابھرتا ہے۔ اس کا مجسمہ چوراہے پر نصب کیا جاتا ہے اور عاشق لوگ اس بت سے جو بھی منت مانگتے ہیں وہ پوری ہو جاتی ہے۔ ناول میں کہیں کہیں ہندوستان اور پاکستان کی آپسی دشمنی کی گونج بھی سنائی دیتی ہے جو کبھی کبھی کھیل کے میدان تک پہنچ جاتی ہے۔ چناں چہ ایک بوڑھا کہتا ہے۔ "اپنی دشمنی کو قائم رکھو مگر کھیل کے میدان کو کھیل کا میدان ہی رہنے دو۔" لگتا ہے ان دو پڑوسی ملکوں کی آپسی رنجشوں کو مٹانے کے لیے بھی کسی نادیو جیسے مہاتما کی بے لوث قربانی کی ضرورت پڑے گی۔

زیر نظر ناول میں سادہ اور سلیس زبان، منفرد تکنیک اور طرز نگارش کا استعمال کیا گیا ہے۔ عام انگریزی الفاظ جیسے فٹ بال، ٹینک، وسٹ اور شیریں، ہندی الفاظ جیسے پرلے، ریکھ، بھون، تھوتی کا استعمال کیا گیا ہے حالانکہ کچھ انگریزی الفاظ جیسے پلیئرز (Player)، جس کا متبادل 'کھلاڑی' اردو میں موجود ہے، کا استعمال غیر ضروری ہے۔

ناول 'نادیو' اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے اور امید ہے کہ اس ناول کی خوب پذیرائی ہوگی۔

○○○

نام کتاب : پروفیسر محمد مجیب کا ڈراما 'خانہ جنگی' ایک مطالعہ
مصنف : ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
ضخامت : ۱۷۵ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : دارالادب، فراش گنڈ بڈگام، کشمیر-۱۹۱۱۱۱
تبصرہ نگار : ایم رحمٰن (دہلی)

زیر نظر کتاب 'پروفیسر محمد مجیب کا ڈراما خانہ جنگی: ایک مطالعہ' کے مصنف معروف ادیب اور محقق ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو کل چار ابواب میں تقسیم کیا ہے:

باب اول: ڈراما اور اردو ڈرامے کی روایت
باب دوم: پروفیسر محمد مجیب کی حیات، شخصیت اور ڈراما نگاری
باب سوم: خانہ جنگی: ایک مطالعہ
باب چہارم: خانہ جنگی کا متن- پروفیسر محمد مجیب

فہرست میں شامل کیے گئے موضوعات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی اہم علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا انتساب اپنے والدین کے نام کرتے ہیں۔ 'پیش گفتار' میں وہ لکھتے ہیں:

جنون آگہی کی یادگار چھوڑ جاؤں گا
صبا کے لب پہ نغمہ بہار چھوڑ جاؤں گا

فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"برسوں پہلے ڈاکٹر کلیم الدین احمد نے اردو تنقید پر خوب رونا رویا تھا اور پھر ان کا رونا اردو والوں کے لیے 'محرک' ثابت ہوا۔ اس طرح اردو تنقید نے ان سے لے کر آج تک بہت بلند پایہ نقاد پیدا کیے، مگر آج اگر کلیم الدین احمد (مرحوم) کی ہی بات اردو ڈرامے کی تنقید کے حوالے سے کہی جائے گی تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ 'پروفیسر محمد مجیب کا ڈراما خانہ جنگی: ایک مطالعہ' دراصل میری اس کوشش کی روداد کی ایک کڑی ہے جس کو میں نے مسلسل کام کرکے تیار کیا ہے..."

فاضل مصنف نے کتاب میں ڈرامے کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً ڈراما کے معنی و مفہوم، تعریف، ڈرامے کے اجزائے ترکیبی، قصہ کہانی اور موضوع، پلاٹ، مکالمہ، ڈرامے کی قسمیں، المیہ اور طربیہ۔

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی مطبوعات میں خود ان کی اپنی شخصیت جھلکتی ہے جو ادب کی دنیا سے داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی کچھ اہم مطبوعات کے نام ہیں: مثلاً: فکر فردا، ناول کا فن ارتقا اور لندن کی ایک رات، تدریس اردو، اردو امتحان، ادبی اقدار اور افکار، ناول پریم چند اور میدان عمل، نکات اردو، ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ڈراما، سید امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی- ایک مطالعہ۔ دراصل ڈراما پر ان کے ہاتھوں لکھی یہ کتاب ایک پر مغز تفسیر ہے۔ یہ ایک سچ ہے کہ فاضل مصنف نے تحقیقی و ادبی جائزہ لیتے وقت اس عہد کے سیاسی، سماجی حالات اور ادبی میلانات سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ کتاب میں اسی تناظر میں پروفیسر محمد مجیب کی حیات اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جب ہم صداقت کے چشمے سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کا قلم بے باک ہے۔ سچائی اور سلیقے سے کہنے کا انھیں ملکہ حاصل ہے۔ امید ہے کہ ڈراما اور فکشن پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب معاون و مددگار ثابت ہوگی۔ اس کتاب کو خرید کر پڑھنے کی سفارش اس لیے بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ نہایت کارآمد ہے جس میں ڈرامے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے بالخصوص ریسرچ کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔

●●●

بقیہ: دانش وروں کا رول

صفحہ ایک سے آگے

زندگی گزارتے ہیں۔ امریکہ کے عظیم ماہر سماجیات C.Wright Mill نے کہا ہے:

"آزاد دانش ور ان چند بچی کچی شخصیتوں میں سے ہے جو فرسودگی اور اس کے نتیجے میں بچی جاندار چیزوں کی موت کے خلاف لڑنے کے تمام ساز و سامان سے آراستہ ہیں"۔

تازگی خیال کا تقاضا ہے کہ ایسی صلاحیت ہو جو عقل و دانش کی فرسودگی کو بے نقاب اور برباد کرتی رہے جو ہم پر یلغار کرتی رہے۔ کبھی کبھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم خبروں کے ایک سمندر میں ڈوبے چلے جا رہے ہیں جو کبھی تو متضاد ہوتی ہیں اور زیادہ تر ان میں محض تکرار ہی تکرار ہوتی ہے۔ یہ قوت عامہ اور خیالات عامہ کی دنیا میں سیاست اور مفادات کے مطابق بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اخبارات، دنیا بھر کے ہر ملک کے سرکاری بیانات، ٹیلی ویژن کے اشتہارات اور خبریں، غرض کہ سارا عوامی ذرائع ترسیل کا نظام ہمیشہ ان لوگوں کے مفادات کی عکاسی کرتا ہے جو ان خبروں کو جنم دینے والے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو اپنے ذہنوں میں یہ بات بالکل صاف کر لینی چاہیے کہ اب یہاں غیر جانب دارانہ رائے جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: متوازی ہندی سینما

صفحہ ۳ سے آگے

ایک پر اثر لوک کتھا پڑھی ہے، جو وہاں مائیں عموماً اپنے بچوں کو کھانا کھلاتے یا سلاتے وقت سناتی ہیں۔ ماحولیات کے تحفظ کے پیغام کی حامل اس دل کو چھو لینے والی کہانی کی مرکزی کردار چیلووی (جو سونالی کلکرنی نے ادا کیا تھا) کو وردان ملا ہے کہ وہ حسب ضرورت اپنے وجود کو ایک خوشبودار پھولوں کے پیڑ میں بدل کر اپنے غریب پریوار کی کفالت کر سکتی ہے، لیکن اگر پیڑ کو گزند پہنچا تو خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ شومئی قسمت سے دوسروں کی لاپروائی کے ہاتھوں خوشبودار پھولوں بھرے درخت کا (اس کا) وجود ٹنڈ منڈ تنے اور ٹوٹی پھوٹی شاخوں میں بدل جاتا ہے جسے بے دردی سے ایندھن کی ٹال میں ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔ راجیو مینن کی عکاسی اور بھاسکر چندرا ورکر کے سنگیت نے اس فلم کو سلولائیڈ پر

ایک حسین نغمے میں ڈھال دیا تھا۔

ڈائرکٹر امول پالیکر کی 'تھوڑا سا رومانی ہو جائیں' (1990ء) اور شیام بینیگل کی 'ویلکم ٹو سجن پور' (2008ء) زندگی کی مثبت قدروں پر اُمیدیں قائم کرنے والی دو انتہائی خوبصورت فلمیں ہیں۔ امول کی فلم دراصل جوسف انتھونی کی 1956ء میں بنی فلم The Rainmaker پر مبنی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک کنواری عورت (انیتا کور) جس کی سپاٹ اور بے رنگ شخصیت اس بے آب و گیاہ علاقے ہی کی طرح بنجر بنی ہوئی ہے جہاں وہ ایک ایسے خاندان کے ساتھ رہتی ہے، جس میں ہر فرد کسی نہ کسی مایوسی یا اندیشے میں مبتلا ہے اور سب سے بڑا خوف انھیں یہ کھائے جا رہا ہے کہ اگر اس سال بھی بارش نہ ہوئی تو وہ شہر خالی کرنا پڑے گا۔ ایسے میں ایک اجنبی آکر دعوا کرتا ہے کہ مقررہ فیس میں وہ وہاں ایک ماہ میں بارش برسا دے گا۔ وہ خاندان اس ناقابل اعتبار خدمت کو اس کے اس عہد پر قبول کر لیتا ہے کہ وہ شخص ایک ماہ تک کہیں نہیں جائے گا۔ اس دوران میں وہ شخص اپنے برتاؤ سے ان کی زندگیاں بدل دیتا ہے، ہر کسی کی نجی کمزوری دور کر کے اُن کی اُمیدیں جگا دیتا ہے۔ اس دوشیزہ کی سپاٹ زندگی میں بھی خوشیوں کے رنگ جھلکنے لگتے ہیں، لیکن مقررہ مدت کے خاتمے پر وہ اچانک غائب ہو جاتا ہے تو سب اسے فریبی سمجھنے لگتے ہیں، لیکن اب اُن لوگوں کا زندگی کی مثبت قدروں پر اعتبار قائم ہو چکا تھا اور پھر سچ مچ برسات ہو جاتی ہے اور اُن کا گاؤں ہی نہیں اُن کی زندگیاں بھی سرسبز ہو جاتی ہیں۔ بینیگل کی فلم ایک بے روزگار گریجویٹ (شریاس تلپڑے) کے گرد گھومتی ہے جو کہیں کام نہ ملنے پر اپنے گاؤں (سجن پور) کے پوسٹ آفس کے باہر نامہ نویسی کا کام شروع کر دیتا ہے۔ طرح طرح کے لوگوں کی چٹھیاں لکھتے ہوئے وہ اُن کے سکھ دکھ، امید و یاس، آرزوؤں، محرومیوں اور کسی کی شرپسندی اور کسی کی بے بسی کے اثرات اپنے وجود پر بھی محسوس کرتا ہے اور اُن کے کام بھی آتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی عورت بھی روزگار کے لیے شہر گئے ہوئے اپنے پتی کو خط لکھوانے اور اس کے خط پڑھوانے آنے لگتی ہے، جو کبھی بچپن میں اُس کی ساتھی تھی۔ چوں کہ نامہ نویس کے دل میں اس کے لیے محبت دبی ہوئی ہے اس لیے وہ نامہ و پیام کو ایسا رُخ دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے پتی کو بھلا دے، لیکن اپنی نیک فطرتی کے باعث وہ اُس کے پتی کے مخدوش حالات اور اپنی بچپن کی ساتھی کی پریشانیاں جان کر خود کو ظاہر کیے بنا اُن کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

وقت کی سب سے اہم ضرورت یعنی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انسان دوستی کا پیغام بھی متوازی سنیما کا ہے بلکہ بے انتہائی موثر طریقے سے پہنچاتا رہا ہے۔ کمال امروہوی کی لکھی کہانی پر ڈائرکٹر یوسف نقوی نے 1977ء میں فلم 'شنکر حسین' پیش کی تھی، جو ایک برہمن کے ذریعے ایک شیعہ بچے کی پرورش اور اس کے نتیجے میں اُلجھے مسائل پر ایک اچھی فلم تھی۔ کمال امروہوی کی لکھی ہوئی ایک نظم (کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی...) جو آیا کیمرہ کے لیے کام نہ آسکی تھی، ہمیں اس فلم میں ملتی ہے۔ ٹی اے رزاق کی کہانی پر مبنی ملیالم فلم 'کو ذور' کے نام سے ڈائرکٹر ناگیش کُکنور نے 2006ء میں ہندی میں پیش کیا تھا۔ اس کہانی میں سعودی عرب میں ملازم دو ہندستانیوں میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کی حادثاتی موت ہو جاتی ہے اور وہ قتل کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اس کے بعد ایک طرف تو قتل کے مسلم ملزم کی باہمت بیوی (گل پناگ) کی اپنے شوہر کو سزا سے بچانے کی پُرصعوبت کوششوں کو دکھایا گیا ہے، دوسری طرف اُس مقتول ہندو کی روایات میں جکڑی بیوہ کے اپنے ذاتی صدمے سے نکل کر اُس کے قاتل کو معاف کر دینے کے طرف کو۔ گل پناگ کا کردار اس لیے بھی فائق نظر آتا ہے کہ وہ ہماچل پردیش سے نکل کر راجستھان کے نامعلوم گاؤں میں اس کی بیوی تک پہنچنے کے تلخ و شیریں تجربوں سے گزرتی ہے۔ اس کے مددگار بہروپیے کے رول میں شریاس تلپڑے کا کردار بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

ڈائرکٹر اپرنا سین کی 2002ء میں ریلیز ہوئی فلم 'مسٹر اینڈ مسز ائیر' جنوبی ہند کی ایک ائیر برہمنی (کونکنا سین شرما) اور ایک مسلم وائلڈ لائف فوٹوگرافر (راہل بوس) کی فساد زدہ علاقوں سے گزرتی ایک بس کے (اور جزوی طور پر ریل کے) سفر کی ہمری کی ایک ایسی داستان ہے، جسے ہمارے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں نصاب کا حصہ بنائے جانے کی ضرورت ہے۔

متوازی سنیما کا یہ کوئی مکمل جائزہ نہیں ہے، پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ 1969ء کے بعد کی نمایاں اور اہم فلموں کا ذکر چھوٹ نہ جائے۔ عوامی اعتبار سے مقبول اور تجارتی طور پر کامیاب چند فلموں ('موسم'، 'آندھی' اور 'نکاح') کا ذکر اس مضمون میں بظاہر نامناسب سمجھا جا سکتا ہے، اس کا جواز یہ ہے کہ اُن فلموں کے موضوع کی ندرت کی وجہ سے اُن کی شمولیت کو ضروری سمجھا گیا۔

ماخذ:

1- Encyclopaedia of Indian Cinema (1999) by Ashish Rajadhyaksha & Paul Willemen

2- Indian Cinema (فیروز رنگون والا)

3- Manorama Year Book 2013 (باب: ہندستانی سنیما کے سو برس)

(نوٹ: اس مضمون میں جن فلموں کے نام آئے ہیں، اُن میں سے 90% فلمیں مضمون نگار نے دیکھی ہیں۔) ●●

بقیہ: تنقید اور ادبی تنقید

صفحہ ۸ سے آگے

واہمہ کا مفہوم سمجھنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے، وہ اپنی فوری ضرورت اور فوری موقف سے آگے کی بات سوچ نہیں سکتا۔ وہ تو حوادثِ روزگار کے ہر موڑ پر بالکل جبلی تحریک سے عمل کرتا ہے، لہٰذا وہ جب بھی کسی آرٹ کی تخلیق کرتا ہے، مثلاً کسی جادو ٹونے کا سہارا لیتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ اپنی ہستی باوجود کی ان بے درد کیفیات واحوال سے جو وہ اور چار کے سے روز کے فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں، دراصل فرار چاہتا ہے اور ایسی چیز تخلیق کرتا ہے جو اس کے خیال میں کامل و مکمل اور وجود مطلق کا ایک نظر آسکنے والا مظہر ہے۔ اس طرح کچھ دیر کے لیے وہ گویا سیّل وجود کو روک تھام لیتا ہے، ایک ٹھوس اور مستحکم شے بنالیتا ہے 'زمان' سے ہٹ کر 'مکان' (Space) کی تخلیق کر لیتا ہے اور اس 'مکان' کی تشریح ایک خاکے کی صورت میں کرتا ہے پھر اس کے جذبات کی شدت اس خاکے کو نہایت ہی موثر شکل عطا کر دیتی ہے اور یہ ایک مرتب قسم کی چیز اور ایک وحدت بن جاتی ہے، جس کو آپ اس کے جذبات وکیفیات کی ایک ہم معنی و ہم نوا تشکیل اور باقاعدہ مرادف کہہ لیجیے۔

تحلیل نفسی نے آرٹسٹک جذبہ و تحریک کی جو تشریح پیش کی ہے اس سے شاید روشنی اس پر اور زیادہ پڑتی ہے، کیوں کہ فرد کی نفسیات کے جو اصول ہیں ان کے مطابق "ہر انتشار عصبی کو ایک ایسی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں آدمی برتری کے حصول کی خاطر کمتری کے احساس سے نجات پانے کا متمنی رہتا ہے"۔ احساس کمتری بالعموم گھرانے کے ماحول میں ابھرتا ہے اور اس کی تلافی کے طور پر احساس برتری عموماً ایک واہمہ کی صورت میں قائم ہو جاتا ہے۔ مافوق الفطرت قسم کی اونچی اونچی تمناؤں کے خواب دکھانے والا یہ واہمہ واہیات تو بیشک بہت ہے مگر لاشعور میں گھر بنائے جما رہتا ہے، البتہ معقولیت، ہمدردی اور تعاون باہمی کے جماعتی معیار و اصول کی وجہ سے دبا رہتا ہے۔ یہ دبا اور چھپا ہوا احساس برتری ویسے تو ہم میں سے اکثر و بیشتر افراد کے اندر موجود ہے لیکن ایک فن کار (آرٹسٹ) اس منزل کبریائی کے معاملے میں بڑا سنجیدہ ہوتا ہے۔ وہ حقیقی زندگی سے فرار اختیار کرنے پر زندگی کے اندر ایک اور زندگی کی جستجو اور اس کی تگ و دو سے رشتہ جوڑ لینے پر مجبور سا ہے، کیوں کہ ایک فن کار اسی بنیاد و مزاج پر فن کار ہوتا ہے کہ وہ اس حیات باطنی کو مثالی شکل و صورت اور کمال بخشنا چاہتا ہے—— فرائڈ بھی اسی خیال کا حامی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "فن کار تو وہی ہے جو فطری اور جبلی احتیاجات کے ان تقاضوں پر چلتا ہو جو حد درجہ پُرشور ہیں، وہ بھوکا ہوتا ہے اعزاز و اکرام کا، طاقت و اقتدار کا، دولت و ثروت کا، شہرت کا اور عورت کی محبت کا لیکن تکمیل تمنا اور حصول آزادگی کے ذرائع سے محروم ہوتا ہے، لہٰذا وہ بے نام تمنا کی طرح وہ بھی حقیقت کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے اور اپنی تمام تر دلچسپیوں کو اور اپنی جملہ تشنگی و ہوس کو بھی اپنی خواہشات کی اس تخلیق کی طرف منتقل و مبذول کر لیتا ہے جو اس کے واہمے کی دنیا میں جنم پاتی رہتی ہے"۔ فرائڈ نے بڑی وضاحت سے یہ بتایا ہے کہ کس کس طرح ایک فن کار اپنے واہموں کی عمارت اٹھا اٹھا کر اس شخصی چیز کو اپنے اظہار کی قوت سے، آرٹ کا ایک غیر شخصی اور ہمہ گیر روپ بخش سکتا ہے اور اسے اتنا دیدہ زیب و دل رُبا بنا سکتا ہے کہ دوسرے بھی اس کی تمنا کرنے لگیں۔

ادب پر نفسیاتی تحلیل کی یہ نگاہ میں تو نہیں ڈالتا لیکن تحلیل نفسی کے اس ماہر نے انتشار عصبی، احساس کمتری، جذبۂ برتری اور واہمہ پر جو کچھ لکھا ہے اس سے توثیق اس حقیقت کی واقعی ہوتی ہے کہ فن کارانہ جذبہ و تحریک ایک فطری چیز ہے اور فن کار کے بارے میں جو یہ بات مشہور ہے کہ وہ مافوق الطبع (ابنارمل) ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں۔ اس کی یہ 'مافوقیت' (ابنارملٹی) بھی فطری ہی ہے اور ہم جس چیز کی بدولت فن کار کی طرف کھنچتے ہیں وہ اس کی مافوقیت یا ابنارملٹی نہیں بلکہ بنیادی طبیعت اور فطریت (نارملٹی) ہے۔ بہر حال وہ جذبۂ تخلیق جو فن پاروں کو وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے اور وہ شعور نقد و انتقاد جو فن پاروں کی تعیین قدر کرتا ہے، دونوں ہمارے اندر موجود ہیں اور یہ دونوں صلاحیتیں خلقی اور فطری ہیں، ان کی فطریت پر اعتراض، خود زندگی کی فطریت پر اعتراض ہے اور ان کی افادیت و قدر سے انکار بھی بہ لفظ دیگر خود زندگی کی افادیت و قدر سے انکار کے مرادف ہوگا۔

مختصر یہ کہ تخلیق و تنقید کا ساتھ بالکل چولی دامن کا ساتھ ہے، زندگی ایک محیط بے کراں ہے اور اس پورے محیط پر بے شمار نقطے ہیں جہاں یہ دونوں باہم مخلوط و مربوط ملیں گے، اس لیے ظاہر ہے کہ کوئی تخلیقی کوشش الگ تھلگ وہ کر وجود میں آ ہی نہیں سکتی کیوں کہ ایک ہی چیز ہے جس کے بارے میں فن کار حد درجہ ذکی الحس ہوتا ہے اور اسی شدت سے اس کا اثر بھی لیتا ہے اور وہ ہے زندگی کی وجیدگی—— یہی سبب ہے کہ ایک فن پارے کے اندر ایسی قوی اور سریع الحلوز لہریں موجود ہوتی ہیں کہ زندگی کے نازک سے نازک، بعید از بعید اور مخفی سے مخفی پہلو بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، لہٰذا وہ تنقید جو اتنے شدید اور اتنے عمیق ارتباط باہمی کی منکر ہو یا آرٹ کے کسی کارنامے کو 'اصول علت و معلول' سے بے تعلق قرار دیتی ہو، وہ تسلی بخش ہرگز نہیں ہو سکتی۔

حواشی:

۱ 'دی یوز آف پوئٹری اینڈ دی یوز آف کریٹی سزم'۔
۲ میک اٹ ناؤ
۳ 'دی یوز آف پوئٹری اینڈ دی یوز آف کریٹی سزم'۔
۴ دی میننگ آف آرٹ۔
۵ پوئٹری اینڈ کرائسس۔
۶ دی میننگ آف آرٹ۔

■◆■

دوسری اور آخری قسط

تنقید اور ادبی تنقید

پروفیسر
کلیم الدین
احمد

(۲)

عام طور سے 'تنقید' کا لفظ جب استعمال کیا جائے تو اس سے مراد ادبی تنقید لی جاتی ہے۔ ایلیٹ کہتا ہے:

''مانتا ہوں کہ تنقید وہ شعبۂ فکر ہے جو یا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ شاعری کیا چیز ہوتی ہے؟ اس کے فوائد کیا ہے؟ یہ کن خواہشات کی تسکین بہم پہنچاتی ہے؟ اشعار لکھے کیوں جاتے ہیں؟ سنائے کیوں جاتے ہیں؟ یا ان تمام باتوں کے متعلق علم و آگہی کے چند شعوری یا غیر شعوری مفروضات قائم کرکے نظم و اشعار کی حیثیت متعین کرتا ہے۔''[۱]

(۱) لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، تنقید کے وظائف دو ہیں، نظری طور پر شعر کی ترکیب و ترتیب کی پیش بندی کرنا، زمین ہموار کرنا اور وہ خدمت انجام دینا جو نشانہ باندھتے وقت بندوق کی مکھی انجام دیا کرتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس قسم کی 'پیش بینی' کی کوئی تحریری مثال جو شعرا کے علاوہ کسی کے لیے بھی سودمند رہی ہو، موجود نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصول نظم و آہنگ کی ابھرتی ہوئی صورت کو پیش کرنے والا تو بس وہی ہے جو اسے برتتا ہے، وجود میں لاتا ہے۔

(۲) شعر کی تراش خراش، اس کی عام نظم و ترتیب کو سنوارنا، جو بات ادا کی گئی ہو اس کی نوک پلک درست کرنا اور مکررات کو چھانٹنا، قلم زد کرنا بلفظ دیگر وہ کام جو کسی نیشنل گیلری یا کسی بایولوجیکل میوزیم میں کوئی اچھی 'مجلس انتخاب' کرتی ہے یا کسی شعبۂ خاص کا نگراں انجام دیتا ہے، یعنی معلومات کو اس طرح مرتب کرنا کہ جب بھی وہ کسی دوسرے شخص (یا نسل) کے سامنے پیش ہو تو اس کا جاندار حصہ فوراً واضح ہو جائے۔ اور فرسودہ و متروک قسم کی باتیں اس کا وقت کم سے کم ضائع کر سکیں۔ اس طرح بقول ایلیٹ وہ نظریاتی حدیں مقرر ہو جاتی ہیں، ایک تو وہ حد ہے جہاں ہم اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ 'شاعری ہے کیا چیز'؟ اور دوسری حد وہ ہے جہاں اس سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ فلاں نظم عمدہ ہے یا عمدہ نہیں ہے، مگر آج تنقیدی ادب کا سارا ذخیرہ مؤخر الذکر ہی سوال سے تعلق رکھتا ہے، یعنی آرٹ کی کسی خاص تصنیف کی خوبی و خرابی کو واضح کرتا ہے یا اس کی قدر متعین کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقدم الذکر سوال کو حل کرنے کی کوشش بھی کچھ کی تو گئی ہے مگر یہ کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔

بہرحال بات صرف اتنی ہی نہیں کہ شاعری کی کوئی موزوں تعریف مل جائے اور جو مل بھی گئی تو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ مسئلے کے زیر نظر مقاصد تو اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں، لہٰذا یہ گتھی اگر سلجھائی جائے تو اس سے نہ صرف یہ ہوگا کہ کم و بیش بے سود قسم کی کوئی نہ کوئی تعریف حاصل ہو جائے گی بلکہ اس رابطے کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو زندگانی و شعر کے درمیان ہے ورنہ یہ مسائل ہنوز حل طلب ہیں کہ مراحل حیات میں شعر و شاعری کس قدر و قیمت کی چیز ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش سعی رائیگاں ہرگز نہیں ہو سکتی مگر عام طور پر تو لوگ اس بات کو پہلے فرض کر بیٹھے ہیں کہ ہم ان ساری باتوں سے آگاہ ہیں اور یہی سبب ہے کہ بیشتر نقادوں نے اپنے آپ کو بس نظم و غزل کی تشخیص و تعیین ہی کے مسائل سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس طرح تنقید کے لازمی اور بنیادی پہلو کی طرف سے نسبتاً غفلت برتی گئی، جس کا نتیجہ لازماً یہی ہونا تھا کہ زندگی اور ادب ـــــ زندگی اور ادبی تنقید کے درمیان ایک تفریق سی پیدا ہو کر رہ جائے۔ چناں چہ ادب کے بارے میں یہ خیال عام ہو گیا کہ اس کی حیثیت روزمرہ کی ضروریات زندگی جیسی نہیں اس کا درجہ وہ نہیں جو ہماری زندگی میں دال روٹی کا ہے بلکہ وہ ایک قسم کی 'لگژری' یعنی تعیش ہے، اس تصور کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ خود ہماری غفلت کے سر ہے، ہم نے زندگی اور ادب کے اس اہم رشتے کو فراموش کر دیا جو چولی دامن کا رشتہ تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ادبی تنقید کے معاملے میں وہ روش چل پڑی جس نے ادبی تنقید کو زندگی سے جدا ایک الگ تھلگ سی بے تعلق چیز بنا کے رکھ دیا اور ادبی نقد و انتقاد کی سرگرمیاں کچھ بہت زیادہ سودمند یا ضروری شے باقی نہ رہیں۔ عام لوگوں کی نظر میں ادبی نقد و انتقاد گویا ایک بے نتیجہ و بے ثمر کام ہے جس میں چند بے وقوف و بےکار وقت گزار آسان ہی قسم کے لوگ اپنے آپ کو الجھاتے ہیں، یعنی بس ایسے لوگ جن کو دوسرے مفید تر کام کرنے کی نہ تو خواہش ہوتی ہے نہ صلاحیت، لہٰذا وہ اسی میں لگے رہتے ہیں۔ ادھر ادبی تنقیدوں کا حال یہ ہے کہ ان پر بڑی عالمانہ اور مختلفانہ فضا طاری رہتی ہے اور جن چیزوں کو ہم زندگی کے اکھڑ اور کھردرے اور عریاں حقائق کے نام سے یاد کرتے ہیں ان سے دور کا بھی واسطہ باقی نہیں رہتا، نتیجہ یہ کہ ان ادبی تنقیدوں کا رخ تجریدی عمومیات کی طرف رہتا ہے اور اگر کبھی تجریدی انداز نہیں بھی ہوتا بلکہ جزئیات و محسوسات کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے تو پھر وہ اور بھی پست ہو جاتی ہیں۔ سطحی قسم کے لفظی اور لغوی تجزیے کے سوا اور کچھ ان میں نہیں ہوتا، یعنی بس وہی ٹیکنیکل کھیل جس کی بدولت نقاد کی ساری محنت و مشقت، ایک بے کیف اور سپاٹ نمائش و نمود بن کے رہ جاتی ہے۔ تنقید کی یہ دونوں صورتیں یکساں بے فیض، بنجر اور بانجھ ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں دلچسپی سمٹ سمٹا کر صرف اس چیز تک محدود ہو جاتی ہے جو نقاد کے پیش نظر ہو اور نقاد کی فوری توجہ کا مرکز بن چکی ہو جاتی ہے وہ دوسری تمام چیزوں سے بے تعلق اور منقطع رہتی ہے اور نقاد اسے پیش بھی قطعاً بے ربطی و بے علاقگی کے جذبے میں کرتا ہے۔

تخلیقی عمل کوئی سطحی اور سرسری شے ہرگز نہیں ہے، یہ تو ایک فطری عمل انسانی ہے اور تھوڑی سی بھی تہذیب جس سوسائٹی میں موجود ہوگی وہاں اس عمل کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس عمل کا ربط دوسرے اعمال و افعال سے بڑا گہرا ہے۔ یہ کوئی الگ تھلگ اور بے علاقہ قسم کی چیز نہیں ہے کہ الگ تھلگ صورت میں پائی جائے، ریڈ لکھتا ہے کہ ''ہماری نگاہیں پلٹ کر ماضی میں ڈوب جاتی ہیں اور صاف دیکھتی ہیں کہ آرٹ اور مذہب ماقبل تاریخ کے دھندلکے سے ہاتھ ڈالے ابھرتے نکھرتے چلے آ رہے ہیں''[۳]

لہٰذا آرٹ کو کسی الگ تھلگ قسم کی چیز (یا کٹی ہوئی ٹہنی) کی طرح ہرگز نہ برتنا چاہیے۔ انسانی سرگرمی و عمل کے دوسرے شعبوں کے ساتھ اس کی وابستگی بڑی گہری ہے بلکہ یہ عرض کرنے کی مجھے اجازت دیجیے کہ یہ ایک 'فطری عمل انسانی' ہے، فطری طلب و تقاضائے انسانی کی تسکین بہم پہنچانے والا ـــــ تاریخ بتاتی ہے کہ آرٹ ایک عمل ہے جو انسان کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا ہے، ماقبل تاریخ کی اولین سے اولین سوسائٹی پر بھی ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ لوگ اپنے گرد و پیش کی دنیا کی 'نقلیں' اتار اتار کر بڑا لطف و سرور حاصل کرتے تھے۔ ان کی یہ کوششیں اگرچہ بڑی بھونڈی اور خام ہوتی تھیں، پھر بھی ان 'نقلوں' کے دیکھنے والے قدر شناس یہیں ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ آرٹ انسان کے بعض فطری تقاضوں کے لیے سامان تسکین مہیا کرتا ہے، اس کے علاوہ آرٹ ہمیشہ متحرک قوت بخش اور حیرت انگیز ہوتا ہے اور ارسطو کی زبان میں تو ''بعض اعتبار سے آرٹ دراصل وجود کی ایک بالیدگی ہے، نمو ہے''۔[۴]

ماقبل تاریخ انسانی کے مطالعے سے اس تخلیقی عمل کی نوعیت و اہمیت واضح طور پر منکشف ہوتی ہے کیوں کہ اوائل عہد انسانی کی آرٹسٹک تخلیق اصل میں زندگی کی مطلق العنان اور دوٹوک انداز کی بے درد کیفیات سے ایک فرار تھی۔ ان کی زندگی میں ہر دن بجائے خود ایک نیا دن تھا، وہ روز اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا کرتے تھے اور وہیں کے وہیں اپنی ضرورت پوری کر لیتے تھے، ان کی زندگی کو استقلال نصیب نہیں تھا، وہ عرصہ اور مدت کے شعور سے بھی محروم تھے، حتیٰ کہ آج بھی ان قبائل کے کسی فرد کو جو تمدن سے بس واجبی ہی سا مس رکھتے ہیں، وعدہ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں　مطبوعہ: ثمرہ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۹۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org